قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی

(۳)

حق گذشتہ صفحات میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ کہ وہ "فرقان" ہے دلیل کی روشنی میں بلاشبہ صحیح دعویٰ ہے اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ میں "حق" ہوں یعنی "باطل" نہیں ہوں بلکہ باطل تو میرے قریب بھی نہیں آسکتا" لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیلٌ من حکیم حمید۔

کیا یہ بات روزِ روشن کی طرح نمایاں نہیں ہے کہ جس کا وصفِ عالی "فرقان" ہو اور جو حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرنا اپنا فرض قرار دیتا ہو وہ جب ہی "فرقان" کہے جانے کا مستحق ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنی حقیقت کے لحاظ سے بھی "حق" ہو کیونکہ حق روشن ہے اور باطل ظلمت، روشنی سے ہی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اچھے برے میں امتیاز پیدا کر دے نہ کہ تاریکی سے جو خود ہی گم گردہ راہ ہو، تم شبِ دیجور سے کب یہ امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری دستگیری اور راہنمائی کا فرض انجام دے سکے گی البتہ چراغِ محفل ضرور محفل کے رنگ و بو اور نیک و بد کو آشکارا کرتا نظر آتا ہے۔

تم جب "حق" کہتے ہو تو گویا یہ کہنا چاہتے ہو کہ جو شے جس طرح ہے جہاں ہے جس کیفیت کے ساتھ ہے اس میں اور تمہاری تعبیر میں کوئی فرق نہیں ہے اور اسی کو عام بول چال میں حقیقتِ نفس الامر کہا جاتا ہے اور جب باطل کا ذکر کرتے ہو تو یہ مطلب لیتے ہو کہ وہ شے جو کچھ ہے جس طرح ہے اور جس شکل و صورت اور کمیت و کیفیت کے ساتھ ہے ہماری تعبیر اس حقیقتِ نفس الامر کا انکار کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہماری تعبیر اصل حقیقت کا کیوں انکار کرتی ہے؟ تو اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ہم "حقیقت" سے ناآشنا اور بے خبر ہیں، نادان اور جاہل ہیں اور دوسرا یہ کہ ہم حقیقت رسی کے باوجود کذب و دروغ سے کام لے رہے ہیں اور یہی مذموم صفت ہماری غلط تعبیر کا منشا و مولد ہے۔

تب ظاہر ہے کہ قرآن "حق" ہی ہو سکتا ہے "باطل" کسی طرح نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قرآن نے جبکہ اپنی حقیقت نمائی کے لئے یہ ثابت کر دیا کہ وہ "الکتاب" اور "الہدیٰ" ہے یعنی عالم الغیب و الشہادہ خدا کی جانب سے منزل اور پیغامِ ہدایت ہے تو بلاشبہ وہ نادان و ناواقف کا کلام نہیں ہے اور اگر خدا کی ہستی ہے اور بے ریب و شک "ضرور ہے" تو لاریب یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ حقایق اشیا کا خالق و مالک ہے پس جو ذات کسی حقیقت کے لئے خالق ہو اس کے متعلق کیسے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنی پیدا کردہ "حقیقت" کے خلاف اظہار و اعلان کرے گی اور اس طرح "حقیقت" کو "بے حقیقت" بنائے گی خصوصاً جبکہ وہ ذات قدسی صفات تمام صفات حسن و کمال کی مالک و حامل ہو۔

پس قرآن جبکہ نہ کذب و دروغ ہے کیونکہ "ہدیٰ" ہے اور نہ نادانی و جہل کا مرقع کیونکہ "کتاب اللہ" اور "الفرقان" ہے لہٰذا اس کا قدرتی اور فطری ثمرہ اور نتیجہ ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ قرآن "حق" ہے "باطل" نہیں ہے "نور" ہے "ظلمت" نہیں ہے "صدق" ہے "کذب" نہیں ہے۔

چنانچہ سورۂ قٓ میں قرآن عزیز نے اپنے اس وصف کو اس آیت میں پیش کیا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ	بلکہ اُن مشرکین نے حق کو جھٹلایا جبکہ وہ اُن کے پاس
فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِيجٍ	آیا پس وہ بے چین اور مضطرب کر دینے والی بات میں مبتلا ہیں

یعنی جو لوگ قرآن کی اس حقیقت کا انکار کرتے اور تعصب کی راہ سے جحود و کفران کو اسوہ بناتے ہیں وہ اس مسئلہ میں سخت اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہیں کہ نہ ان کو حق و صداقت کی روشنی کا انکار کرتے بن پڑتا ہے اور نہ اس کے پیغام و صداقت کے قبول پر طبیعت کو آمادہ کر پاتے ہیں، جب وہ ڈھیٹ بن کر زبان سے انکار کرتے ہیں تو ضمیر کی آواز نفرت و ملامت کرتی سنائی دیتی ہے اور جب اقرار کرنا چاہتے ہیں تو نفسانی خواہشات اور قومی عصبیت کی ظلمتیں اقرار سے باز رکھنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں

اور یہ بے وقوف وادیٔ حیرت و اضطراب میں سرگرداں رہتے اور گم کردہ راہ انسانوں کی مردم شماری میں اضافہ کرتے نظر آتے ہیں۔

مفسرین نے اس مقام پر "الحق" کی تفسیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی "نبوتِ ثابتہ" اور "معجزات" سے بھی کی ہے مگر ان ہر دو تفاسیر کے پیشِ نظر بھی قرآنِ عزیز کے "الحق" ہونے اور اس آیت کی تفسیر میں اُس کے شامل و داخل رہنے کا مسئلہ اپنی جگہ اُسی طرح قائم ہے اس لئے کہ جس طرح "برہان" کی بحث میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس یا آپ کے معجزات اگر "برہانِ رب" ہیں تب بھی قرآن کا "برہان" ہونا اپنی جگہ مستقیم اور صحیح ہے۔ اسی طرح یہاں بھی یہ کہنا بے محل نہیں ہے کہ "قٓ والقراٰن المجید" کے بعد اگر "کذّبوا بالحق" کا اعلان کیا گیا ہے تو خواہ اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تامّہ اور آپ کے معجزات ہی کیوں نہ مراد ہوں مگر قرآن پھر بھی اس لئے "الحق" ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کے معجزات کے ثبوت کے لئے قرآن سے بڑھ کر کون "حق" ہو سکتا ہے اور کیا اس "حق" کی تکذیب کے باوجود اقرارِ رسالت اور اعترافِ معجزات کو "ایمان بالحق" کہا جا سکتا ہے؟

غرض بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ آیت "کذّبوا بالحق" کا مصداق بلا شبہ قرآنِ حکیم ہے۔

آیئے ہم قرآنِ عزیز کے اس دعویٰ کی صداقت کو ادیان و ملل کی تاریخ کے سامنے پیش کر کے اُس سے فیصلہ حاصل کریں کہ یہ کہاں تک درست ہے؟ ہندوستان کے مذہبِ قدیم کی یادگار وید کو بتلایا جاتا ہے لیکن چاروں وید کے مطالعہ کے بعد بھی یہ پتہ لگانا ناممکن ہے کہ جس طرح ہندوستان میں خدا کا پیغامِ حق سنایا گیا تھا کیا یہی پیغامِ حق کائنات کے اور گوشوں میں بھی سنایا گیا ہے اور یہ پیغام خدا کے کس برگزیدہ رسول کی معرفت سنایا گیا اور کائناتِ انسانی کے دوسرے حصوں اور خطوں میں بھی اسی طرح خدا کے پیغمبر اور رسول آئے ہیں یا نہیں۔

اسی طرح یہود سے موجودہ عہدِ قدیم (توراۃ) اور نصاریٰ سے عہدِ جدید (انجیل) کو لیجئے اور مطالعہ کے بعد بتلایئے کہ بنی اسرائیل کے خانوادہ کے علاوہ کیا خدا نے کسی اور قوم و نسل سے پیار کیا اور دوسرا کوئی

ملک بھی پاک نبیوں اور رسولوں کا مہبط رہا ہے یا نہیں تو سکوت یا نفی کے ماسوا دوسرا جواب نہیں ملے گا۔

نیز آج اوستا اور ژند سے یہ توقع بیکار ہے کہ وہ فارس اور آذربیجان کی طرح یہ بھی بتلائے کہ ہندوسندھ چین وماچین یورپ وایشیا افریقہ وامریکہ کے کسی گوشہ میں بھی زردشت کی طرح کوئی خدا کا پیغامبر اور رسول آیا ہے اور کب آیا ہے اور اس کی پیغام رشد وہدایت کے اصول کیا رہے اور کیا تھے۔

غرض موجودہ ادیان وملل کی تاریخ اس حقیقت کے اعلان سے قاصر ہے کہ جبکہ خدا ایک ہے اور یہ تمام کائناتِ ہست وبود اُسی ایک خدا کی مخلوق ہے تو بلاشبہ اُس کا پیغامِ حق بھی ہمیشہ سے ایک اور صرف ایک ہی ہے اور وہی پیغامِ حق تخلیقِ آدم سے آج تک کائنات کے ہر گوشہ میں سنایا جاتا رہا ہے اور اپنے آغاز سے انجام تک ایک ہی حقیقت کا داعی ومنادی رہا ہے۔

لیکن جب جھلسے ہوئے پہاڑوں اور تپتی ہوئی ریت کے درمیان "وادی غیر ذی زرع" میں سب سے پہلے خدا کی آواز گونجی تو فاران کی چوٹیوں اور حجاز کے میدانوں نے وہ سب کچھ سنا جس کے سننے کی ہر ایک انسان کو جستجو تھی اور جس کے اعلان کی ہر ملتِ حقہ سے توقع کی جا سکتی تھی۔

یہ قرآن ہی کی آواز تھی جس نے بار بار پکارا "وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر" کوئی امت ایسی نہیں ہے جس میں خدا کی جانب سے خوف دلانے والا نہ گزرا ہو" ولکل قوم ھاد۔ اور ہر قوم میں ہادی آئے"۔ "ولقد ارسلنا رسلاً من قبلك منهم من قصصنا علیك ومنهم من لم نقصص علیك۔ اور ہم نے بھیجے ہیں بہت رسول تجھ سے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے) پہلے بعض ان میں وہ ہیں کہ جن کا احوال ہم نے تجھ کو سنایا اور بعض وہ ہیں کہ ان کا حال نہیں سنایا"۔ "لا نفرق بین احد من رسلہ۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ ہم کسی رسول کے رسول ہونے میں کوئی فرق نہیں کرتے" یعنی جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا سچا رسول جانتے ہیں اُسی طرح کائنات کے ہر گوشہ میں خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانا فرض سمجھتے ہیں۔

غور کیجئے مذکورہ بالا حقیقت پر اور فیصلہ حاصل کیجئے تاریخ کے اس روشن صفحہ سے کہ قرآن ہی وہ کتاب ہے جس نے ببانگِ دہل دنیائے مذہب کے سامنے اس فراموش شدہ حقیقت کو

اجاگر کیا کہ خدا ایک ہے تو اس کی صداقت کا پیغام بھی ایک ہی ہے اور وہی مختلف زبانوں میں خدا کے سچے پیغمبروں اور نبیوں کی معرفت سنایا جاتا رہا ہے اور یہی وہ پیغام حق ہے جس کو آج کامل و کمل صورت میں "الحق" کے نام سے تم کو سنا رہا ہوں۔ فهل ثم داعٍ او مجیبُ اذانٍ" پس ہے کوئی جو آج میری طرح یہ صدا لگائے یا کم از کم میری صدائے حق پر کان دھرے۔

مُصَدِّق | قرآن جبکہ "حق" ہے اور اُس کے پیغامِ حق و صداقت کا اعلان گویا ہدایت اور مشاہدہ کا اعلان ہے تو حق کی صفاتِ عالیہ میں سے ایک بڑی صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہر ایک حق کی تصدیق کرے اور تائیدِ حق سے اس کی صداقت و حقانیت کو زینت بخشے اس لئے قرآن نے اس گوشہ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا اور شوکتِ تعبیر کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ وہ خدائے برحق کے سچے ادیان و ملل اور خدا کی سچی کتابوں اور اس کے پیغاماتِ حق کے لئے "مصدّق" بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آج انبیاءِ سابقین کے الہامی صحیفے محرّف ہی کیوں نہ ہوگئے ہوں اور خود اُن کے ماننے اور اُن پر اعتقاد رکھنے والوں نے ان کی حقیقت کو بڑی حد تک مسخ ہی کیوں نہ کردیا ہو لیکن میں اس حقیقت کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا بلکہ اپنے ماننے اور قبول کرنے والوں کے ایمان و اعتقاد کا جزء بنانا چاہتا ہوں کہ توراۃ، زبور انجیل اور کائناتِ انسانی پر منزل من اللہ دوسرے تمام صحیفے اور الہامی کتابیں سب ہی حق کا پیغام اور رشد و ہدایت کا سامان رہی ہیں اور آج بھی تحریف و مسخ کی ظلمتوں کے باوجود ان میں کہیں کہیں روشن خد و خال اور حقیقی شکل و صورت کی جھلک نظر آجاتی اور اپنی صداقت و حقانیت کا جلوہ دکھا کر عبرت و موعظت کا صور پھونکدیتی ہیں۔ "اٰمنوا بما نزلنا مصدقاً لما معکم۔ ایمان لاؤ اس کتاب پر جو ہم نے نازل کی جو تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں۔" "وانزلنا الیك الكتاب بالحق مصدقاً لما بین یدیه من الكتاب ومهیمناً علیه - اور تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی، تصدیق کرنے والی سابقہ کتابوں کی اور اُن کے مضامین پر نگہبان۔"

مُهَیمِن | اس لئے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میرا کام صرف یہی نہیں ہے کہ میں گذشتہ کتابوں اور صحیفوں کی تصدیق کروں اور نبیوں اور رسولوں کے گذر جانے کے بعد اُن کی امتوں نے جو تحریفیں اُن کے اندر کی ہیں

اور اُن پر مسخ کی کند چھری چلائی ہے اُن سے اغماض کر جاؤں۔ کیونکہ اگر ایسا کروں تو اپنے وصف "الحق" کی خلاف ورزی کا مرتکب بنتا ہوں جو کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے یہ واضح رہے کہ میں سابقہ کتابوں اور گذشتہ صحیفوں کے مضامین اور تعلیمات پر مہیمن اور نگہبان بھی ہوں اور میرا یہ فرض ہے کہ میں ان کی تصدیق کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلاؤں کہ خدا کی ان مقدس کتابوں کی حقیقی تعلیم کیا تھی اور اُس کو مسخ یا فراموشی کے نذر کر کے کیا سے کیا بنا دیا گیا

گویا یوں کہہ لیجئے کہ اگر امم سابقہ اور ادیان و مللِ سابقہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر فلسفۂ تاریخ کا نقاد تنقیدی نظر سے حق و باطل کے امتیاز کی خواہش رکھتا ہو تو صرف قرآنِ حکیم ہی اُس کے سامنے "حق" "مصدِق" اور "مہیمن" بن کر اس کے نیک مقصد کے لئے مشعلِ راہ اور اُس کی پاک خواہش کے لئے رہبر و راہنما ہونے کا حق رکھتا ہے اور اسی کی راہنمائی اس کو صراطِ مستقیم تک پہنچا سکتی ہے۔

قرآن کے "حق" "مصدِق" اور "مہیمن" ہونے کی سب سے روشن اور نمایاں دلیل اُس کی وہ دعوتِ حق اور اس کا وہ پیغامِ صداقت ہے جس کو اُس نے تمام اہلِ کتاب کے سامنے اس اعجاز کے ساتھ پیش کیا ہے،

قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى	اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہئے اے اہلِ کتاب! آؤ
كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ	ایک بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ
اِلَّا اللهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا	ہم بندگی نہ کریں مگر اللہ کی اور کسی کو اس کا شریک
يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ	نہ ٹھیرائیں اور نہ کوئی کسی کو اپنا رب بنائے اللہ کے
دُوْنِ اللهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا	ماسوا پھر اگر وہ اس بات کو قبول نہ کریں تو کہہ دیجئے
بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔ (آلِ عمران)	گواہ رہو ہم تو اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔

کیا اس سے بھی زیادہ وسعتِ نظر، فطرتِ حق، تعلیمِ صداقت، احترامِ مذاہب، وحدتِ کلمہ اور وحدتِ نظام کی دعوت کہیں مل سکتی ہے۔ اور کوئی پیغامِ حق اس سے زیادہ عظمت و حقانیت کا ثبوت فراہم کر سکتا ہے؟ انصاف تو یہ ہے کہ ان تمام مسائل کو اگر یکجا دیکھنا ہو تو اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ ایسی کتاب بلاشبہ قرآن ہے۔

کون نہیں جانتا کہ سابقہ کتبِ سماوی میں حضرتِ آدم کی تخلیق اور ہبوطِ ارضی سے متعلق کتنے دور از کار قصے اور کتنی داستانیں ہیں جو رنگ آمیزی کے ساتھ بیان ہوئی ہیں لیکن یہ قرآن ہی ہے جس نے رطب ویابس کو جدا کرکے اصل خدوخال کو رونما کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی سفینہ سازی اور طوفانِ نوح سے متعلق عجیب وغریب حکایات عقلِ سلیم کو جب ہمنوا نہ بنا سکیں تب قرآن ہی کی روشنی نے پردہ ہائے ظلمت کو چاک کرکے حق وصداقت کے سپیدۂ سحری کو چار چاند لگادے۔ حضرت لوط (علیہ السلام) پر اپنی بیٹیوں کے ساتھ مباشرت کی افتراپردازی آج تک بائبل کی کذب بیانی کا مرقع پیش کرتی ہے۔[۱]

یہ قرآن ہی کی مقدس تعلیم تھی جس نے آگے بڑھ کر اس کذب وافترا کی ببانگِ دہل تردید کرتے ہوئے لوط (علیہ السلام) کے دامنِ پاک کو بے لوث ثابت کردکھایا۔

کذّبت قوم لوط المرسلین۔ اذ	جھٹلایا لوط کی قوم نے پیغمبروں کو جبکہ ان کے
قال لہم اخوہم لوطٌ الا تتقون	بھائی لوط نے اُن سے کہا بیشک میں تمہاری جانب
انی لکم رسول امین فاتقوا اللہ واطیعون	خدا کا پیغامبر ہوں امانت والا، پس اللہ سے ڈرو
وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری	اور میری پیروی کرو اور میں تم سے اجرت نہیں
الا علیٰ رب العلمین۔ (الشعراء)	مانگتا میرا اجر اللہ رب العالمین کے پاس ہے۔

اس نے خدا کا پیغمبر کہہ کر سارا معاملہ صاف کردیا اور ایک ذی فہم کو سمجھا دیا کہ جو نبی اور پیغمبرِ خدا بنتا ہے وہ بداخلاقیوں سے کوسوں دور اور معصوم از معاصیات ہوتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) نبی بھی ہوں اور العیاذ باللہ مرتکب معصیت بھی ہوں۔

پھر اسی عہدِ قدیم (توراۃ) کا بیان ہے کہ گوسالہ سامری نے نہیں بلکہ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے بنایا تھا۔[۲] مگر قرآن عزیز نے صاف اور صریح الفاظ میں تردید کی کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) جیسے مقدس نبی کا دامن اس آلودگی شرک سے قطعاً بے لوث ہے اور عہدِ جدید انجیل نے گواہی دی ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت باسعادت معجزانہ طور پر نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ رخصتی سے قبل

---

[۱] پیدائش باب ۱۹ آیات ۳۲ - ۳۸ - [۲] خروج باب ۳۲ - آیات ۵ - ۹ -

یوسف نجار کی صلب سے مریم (علیہا السلام) کے رحم میں منتقل ہو کر بن یوسف نجار تھے تب قرآن ہی نے اس حقیقت کو آشکار اکیا کہ حضرت مریم کا دامنِ عصمت ہر طرح محفوظ رہنے اور کسی مرد کی مقاربت سے ناآشنا ہونے کے باوجود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت بحکم خدا معجزانہ انداز میں ہوئی ہے۔

غرض قرآنِ عزیز کی یہی وہ صفتِ عالی ہے جو "مہیمن" بن کر عقائد و اعمال دونوں شعبوں میں پیدا کردہ آلودگیوں کے زہر کو تریاق سے جدا کرتا اور ادیان و ملل کی حقیقی صداقت کو نکھار کر دنیائے انسانی کی راہنمائی کرتا ہے۔

ذکر. ذکریٰ تذکرہ

قرآنِ عزیز سابقہ ادیان وملِ حقہ کے لئے جبکہ مصدّق اور مہیمن ہے اور جبکہ وہ رہتی دنیا تک کے لئے دینی و دنیوی رشد و ہدایت کا امام اور کفیل ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ گذشتہ ملتوں اور ان میں بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کے واقعات و حالات کا ذکر کرے اور بتلائے کہ قبول کرنے والوں نے خدا کی جانب سے کیا صلہ پایا اور منکرین و جاحدین نے اپنے انکارِ حق و صداقت کی پاداش کس طرح پائی تاکہ موعظت و نصیحت کا باب کامل و مکمل ہو سکے اور آنے والی قومیں اپنے انجام نیک و بد کو اچھی طرح پہچان سکیں اور اس طرح خدا کی حجت تمام کائنات پر پوری ہو جائے۔

قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ بیشک یہ صحیح ہے اور اسی لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ میری صفاتِ عالیہ میں سے ایک نمایاں صفت "ذکر" بھی ہے۔ اسی لئے خدا رسی اور کائناتِ انسانی کی ہدایت و سعادت کے لئے میں نے گذشتہ اقوام و ملل کی اس تاریخ کو دہرایا جو نیک و بد اور خیر و شر اور اُن کے انجام و نتائج سے گہرا تعلق رکھتی اور صاحبِ عقل و بصیرت کے لئے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کرتی ہے۔

میرا وجود اس لئے سرتاسر ذکر ہے کہ میں دین، شریعت اور احکامِ الٰہی اور اُن سے متعلق وعد و وعید کا بیان کرتا ہوں اور اس لئے ذکر ہے کہ انبیاء و رسل کے قصص و اخبار اور امم و اقوام کے قبولِ ہدایت و ضلالت اور اُن کے عواقب و ثمرات کو واضح اور نمایاں رکھتا ہوں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ موعظت ونصیحت کے لئے دلائل وبراہین میں سب سے بڑی دلیل اور سب سے بلند برہان گذشتہ واقعات وشہادات ہوتے ہیں اور قلب صادق اور ضمیر حق کے لئے سرمایۂ عبرت ونصیحت بنتے ہیں تو پھر انصاف کرو اور بتلاؤ کہ مجھ سے بڑھ کر اس میدان کا مرد کون ہے اور کون سا صحیفہ اور کون سی کتاب ہے جو اس جلالت وفخامت کے ساتھ ان حقائق کو روشنی میں لاکر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فرض انجام دیتی ہو اور نورِ ہدایت سے فیض یاب کرنے اور ظلمتِ ضلالت سے نجات دینے کا باعث بنی ہو۔

میں ذکر ہوں اس لئے نہیں کہ ایک تاریخی کتاب ہوں جو صرف قصص وحکایات کو اپنے حقیقی خدوخال میں پیش کرکے نتائج وعواقب کو اربابِ مطالعہ پر چھوڑ دیتی ہے میں صرف فلسفہ بھی نہیں ہوں کہ تاریخی واقعات کے اسباب وعلل پر بحث کرکے نظری اور علمی کاوشوں کا مخزن ہوکر رہ جاؤں، میں کوئی قصہ کہانی نہیں ہوں کہ "اساطیر اولین" کو بیان کرکے گرمیٔ محفل کا باعث بن کر داد حاصل کروں بلکہ میری تعلیم اور میرا پیغام کائناتِ ہست وبود کی سعادتِ ابدی اور فلاحِ سرمدی کے لئے آبِ حیات ہے، دعوتِ حق کے لئے برق کی چمک اور رعد کی کڑک ہے یا صوتِ ہادی ہے، دنیوی کامگاریوں اور کامرانیوں کے لئے نسخۂ کیمیا ہے اور دینی مسرتوں اور شادکامیوں کے لئے معجزۂ حق وصداقت ہے۔

پس میں تاریخی واقعات اس لئے بیان کرتا ہوں کہ اُس کے صرف اُن پہلوؤں کو روشنی میں لاؤں جو عبرت وموعظت اور رشد وہدایت کے لئے مفید وموثر ہوں، میرے ذکر وتذکار میں فلسفۂ تاریخ بھی اس لئے ہوتا ہے کہ وہ عواقب وثمرات اور علل واسباب کو بیان کرکے صراطِ مستقیم کی جانب راہنمائی کرے۔ محض قصص وحکایات بیان کرنا نہ میرا منصب ہے نہ میرا مقصد ومنشا۔ اس لئے میں داستان سرائی نہیں کرتا بلکہ ماضی سے مستقبل اور گذشتہ سے پیوستہ کے لئے سامانِ سعادت اور اسبابِ فلاح ونجاح مہیا کرتا ہوں پس میں "ذکر" بھی ہوں اور "ذکریٰ" بھی "تذکرہ" بھی اور "ذی الذکر" بھی۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (ص)	"یہ (قرآن) نہیں ہے مگر جہانوں کے لئے ایک ذکر (نصیحت)"
وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (زخرف)	"اور بلاشبہ یہ (قرآن) تیرے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) لئے اور تیری قوم کے لئے ذکر (نصیحت) ہے"
صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ۔	"صٓ اور قسم ہے قرآن، صاحبِ ذکر کی"
وَمَا هِیَ اِلَّا ذِكْرٰی لِلْبَشَرِ (مدثر)	"اور نہیں ہے یہ (قرآن) مگر نصیحت انسان کے لئے"
كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ۔ (عبس)	"آگاہ ہو، یہ (قرآن) تذکرہ ہے پس جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے"
فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ۔ (مدثر)	پس اُن کو (مشرکین و منکرین کو) کیا ہوا کہ وہ تذکرہ (نصیحت) سے اعراض کرتے ہیں۔

موعظۃ قرآن، جب حق و صداقت کا داعی، رشد و ارشاد کا منادی، ہدایت و سعادت کا ہادی، امتیازِ حق و باطل کا امام ہے اور ادائے فرض کی خاطر ذکر و ذکریٰ اور تذکرہ ہے تب اس کا ایک اہم فرض یہ بھی ہو جاتا ہے کہ کائناتِ عقل و بصیرت کی موعظۃ و نصیحت کے لئے ذاکر و واعظ بھی ہو کیونکہ اگر اس کا فرض صرف اسی قدر ہوتا کہ وہ امم و اقوام اور ملل و ادیان کی تاریخ کو دہرا دیتا اور ~~کت~~ ہو جاتا وہ رشد و ہدایت کا سامان جمع کر دیتا اور فارغ ہو جاتا، وہ حق و باطل کا امتیاز ظاہر کر دیتا اور خاموش ہو جاتا تو پھر قرآن اپنے فرض کا تارک ٹھیرتا وہ تو کہہ چکا ہے کہ حق و صداقت کے یہ تمام سامان اس نے اس لئے مہیا کئے ہیں کہ انسان کو "انسان" بنائے اور "حیاتِ سرمدی اور نجاتِ ابدی" تک پہنچائے تب اس کے لئے یہ گنجائش ہی کب ہے کہ وہ سامان تو مہیا کر دے، اسباب و وسائل اور علل و ذرائع کو تو شمع شبستان بنا دے لیکن اصل مقصد اور حقیقی مطمح نظر کو نظر انداز کر کے غفلت و حق پوشی کی راہ اختیار کرے اس لئے وہ اعلان کرتا ہے کہ میں "موعظت" ہوں یعنی مقامِ وعظ و تذکیر میں میرا مقام اس قدر بلند ہے کہ میرے لئے یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ میں "واعظ" یا "ذاکر" ہوں بلکہ میری اس حقیقی صفت یا میرے اس فرضِ منصبی کا حق پورا پورا جب ہی ادا ہو سکتا ہے کہ کہا جائے

قرآن "ذاکر" ہی نہیں سر تا سر "ذکر" ہے "واعظ" ہی نہیں بلکہ اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ "موعظۃ" ہے۔

غور کیجئے کہ عدل و انصاف کسی ایک کی میراث نہیں ہے اس لئے اس عالم رنگ و بو میں خدا معلوم کس قدر "عادل و منصف" گذرے ہیں، موجود ہیں اور آئندہ رہیں گے لیکن جب اِن عادلانِ حق گوش و حق نیوش میں سے عدل و انصاف کا کوئی ہیرو اس صفت میں چار چاند لگا دیتا ہے تو آپ ہیرو درشب (مشاہیر پرستی) کے ذوق وولولہ میں اس کو فقط عادل نہیں کہتے بلکہ اس کو سر تا سر "عدل" بنا دیتے ہو پس اگر کلام کی فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ معیار اس کا متقاضی ہے کہ عدل ہو یا ظلم یا کوئی بھی صفت ہو وہ جب کسی ہستی میں درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے وصف کی تعبیر اسمِ فاعل اور مبالغہ کے صیغوں سے گذر کر عینِ صفت ہی کے ذریعہ بہتر سمجھی جاتی ہے تو تاریخِ ادیان و ملل اور صحفِ سماویہ اور کتبِ الٰہیہ کی تاریخ میں میری روشن رشد و ہدایت اور جلیل و رفیع نصیحت کا ذکر کیوں نہ اس طرح کیا جائے کہ میں صرف واعظ ہی نہیں ہوں بلکہ ادارِ فرض میں بھی سب سے آگے، سب سے بلند اور سب سے وقیع ہوں اور اس لئے "موعظۃ" ہوں یعنی میرا سراپا ہی سر تا سر نصیحت و موعظت ہے۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ	اے لوگو بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار
مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (یونس)	کی جانب سے نصیحت آپہنچی۔
فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ	پس جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی طرف سے اور وہ
فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ۔ (بقرہ)	باز آگیا تو اس کے واسطے ہے جو پہلے ہو چکا۔

اس آیت میں ربوا کی حرمت کا ذکر ہے اور قرآن کی آیات موعظت نے اس کو حرام قرار دیتے ہوئے تسکین بھی کر دی کہ جو اس حکم سے قبل یہ معاملہ کر چکے تو گذشتہ پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

ولقد انزلنا الیکم ایات مبینات	اور ہم نے تم پر صاف اور واضح آیات اتاریں اور
ومثلاً من الذین خلوا من قبلکم	ان کا حال جو تم سے پہلے گذر چکے اور "نصیحت"
وموعظۃ للمتقین۔ (نور)	ڈرنے والوں کے لئے۔

وجاءك فی ھذہ الحق وموعظۃ وذکرٰی للمؤمنین ۔ (ہود)
اور آئی تیرے پاس اس میں (قرآن کی سورۃ میں) تحقیقی بات اور نصیحت اور یاد داشت ایمان والوں کے لئے ۔

ھٰذا بیانٌ للنّاس وھدًی و موعظۃ للمتقین (آل عمران)
یہ (قرآن) بیان ہے لوگوں کے واسطے اور ہدایت اور نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لئے

قرآن عزیز نے دعوتِ حق کے لئے جن اساسی اصولوں کا اعلان اور پیغامِ الٰہی کو جن محکم بنیادوں پر قائم کیا ہے اس میں حکمۃ کو مقدم رکھا ہے اور موعظۃ کو دوسرا درجہ عطا کیا ہے اور آخری منزل مجادلہ اور مذاکرہ کی رکھی ہے چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوتا ہے ۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بالحکمۃ والمَوْعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالّتی ھی احسن ۔
(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم اپنے پروردگار کی راہ کی جانب دعوت دو حکمت و دانائی کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے ذریعہ اور ان (منکرین) سے مذاکرہ کرو بہتر اسلوب کے ساتھ ۔

تو اس آیت میں "موعظۃ" کی حقیقت کیا ہے اور اس کو ثانوی درجہ کیوں حاصل ہے اور قرآن کی صفت "موعظۃ" اور آیت مسطورہ بالا میں مذکورہ موعظۃ کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس کی تحقیق سے قبل اس تمہید پر نظر رکھنا ضروری ہے کہ دعوت و پیغام کے یہ سہ گانہ اصول دراصل فطری اور طبعی تقاضا کے پیشِ نظر بیان ہوئے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ جب کوئی شخص کسی مخاطب سے گفتگو کرتا ہے اور اس کو کسی اہم مقصد کی خاطر افہام و تفہیم کی مہم پیش آتی ہے تو وہ مخاطب کے ذہنی نشوونما اور فکری صلاحیت و استعداد کو صرف تین درجات کے اندر محدود پاتا ہے ۔ پہلا اور اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ مخاطب کا ذہن ثاقب اور فکرِ رسا بلند و رفیع ہو اور وہ افکارِ ذہنی کو اوہام و وساوس سے یقین و اذعان کو ریب و ظنون سے صحیح و محکم کو فاسد و کاسد سے امتیاز کرنے میں وجدانِ صحیح اور عقلِ سلیم کا حامل ہو تو اس شخص کے سامنے جب خاص عقائد و افکار اور اعمال و افعال کو پیش، اور اُن کی صداقت و حقانیت کو واضح کیا جائے تو از بس ضروری ہے کہ دلائل و براہین اور شواہد

نظائر" حکمت سے مملو" اور دانائی سے لبریز ہوں تاکہ وہ حقیقت اور سراب کے درمیان بآسانی امتیاز کر سکے اور حق وباطل کو حکمت کی ترازو اور دانائی کے پیمانہ سے ناپ تول سکے اس لئے کہ افہام وتفہیم اور تکلم وتخاطب میں" حکمت" سے بڑھ کر نہ کوئی شمع ہدایت ہے اور نہ کوئی آفتاب برہان ودلیل۔

اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اُس کی فکری اور ذہنی نشو وارتقاء نے توسط سے آگے قدم نہ بڑھایا ہو اور وہ حق وباطل کی گوناگوں دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کا تحمل نہ رکھتا ہو وہ آفتاب کا مشاہدہ تو کر سکتا ہے لیکن اس کی بنفسجی شعاعوں اور زرد وگلابی کرنوں اور ان کی تحلیلی شکل میں افادی کارفرمائیوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ اس کی گرمی اور چمک کا تو صحیح اندازہ کر سکتا ہے لیکن اس کے کرۂ ناری اور اس کے نظامِ شمسی کے حقائق تک پہنچنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہے تو ایسے شخص تک ابلاغِ حق اور پیغامِ دعوت کا طریقہ یہ ہے کہ" حکمت" کے ساتھ ساتھ" موعظۃ حسنۃ" کی تائید بھی شامل کر لی جائے یعنی دعوت وتبلیغ کا فرض صرف" حکمت" ہی تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ ضروری ہے کہ گذشتہ اقوام وادیان کے حالات وواقعات اور مشاہدات کو اچھی نصیحت کے ذریعہ بیان کر کے ماضی سے مستقبل کے لئے اور گذشتہ سے پیوستہ کے لئے سبق حاصل کرنے کی امنگ پیدا کی جائے اور اس کو خوگر بنایا جائے کہ وہ حکمت کی باتوں کو موعظتِ حسنہ کے ذریعہ حاصل کر سکے تاکہ صاحب فہم وذکا جو اول مرحلہ پر ہی سمجھ گیا ہے یہ اس دوسرے مرحلہ پر پہنچ کر اس کا ادراک کر سکے۔

مگر ان دونوں درجات سے علاوہ ذہنی اور فکری طریق کار کے لئے ایک اور درجہ بھی ہے جو کبھی کج فہمی اور کج روی کی وجہ سے بروئے کار آتا ہے اور کبھی متوازی دلائل وبراہین کے غلط دعاوی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ تیسرا درجہ ہے جہاں پہنچ کر ایک انسان کسی حقیقت وصداقت کو سمجھنے اور قبول کرنے سے قبل اپنی جانب سے اُس کے متوازی اور متضاد دلائل پیش کر کے مجادلہ اور مذاکرہ کا ارادہ کرتا اور اسی ترازو اور پیمانہ سے ہر ایک بات کو ناپتا اور تولتا اور اس کے حق وباطل ہونے میں فرق کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ ذہنی اور دماغی طریقِ فکر کے اسی مرحلہ یا درجہ کا اصطلاحی نام" مناظرہ" ہے۔

پس جبکہ قرآنِ عزیز کی تعلیم ایک فطری تعلیم ہے اور دینِ اسلام، دینِ فطرت کا دوسرا نام تو ضروری تھا کہ اس کی دعوت و تبلیغ کے اصول بھی فطرت کے مطابق اور دماغی اور ذہنی نشوو ارتقا کے فطری تقاضہ کے متوازی ہوں تاکہ اسلامی دعوت اور قرآنی پیغام صحیح معنی میں کائنات انسانی کے لئے کامل و مکمل کہلائے جانے کی سند حاصل کرسکے۔ تب اس نے کہا کہ اس پیغامِ حق کا طریق کار بھی ان ہی فطری صلاحیتوں کے ساتھ وابستہ ہے اور جو دماغ جس طریقِ فکر کا عادی ہے بہتر ہے کہ اس طریقِ فکر کے ساتھ اس کی راہنمائی کی جائے اور چونکہ تیسرے درجہ میں کج بحثی اور زیغ کے امکانات موجود تھے جو انسان کو اخلاق سے بداخلاقی اور بلندی سے پستی کی جانب گرادیتے ہیں تو یہ بھی ضروری ہوا کہ مجادلہ و مذاکرہ کو "بالتی ہی احسن" کی پاک اور بے لوث شرط کے ساتھ مشروط کردیا جائے یا یوں کہدیجئے کہ اس درجہ کو حُسنِ اخلاق اور مثلِ اعلیٰ کی حبلِ متین سے باندھ دیا جائے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد اب یہ کہنا آسان ہوجاتا ہے کہ قرآن عزیز جس معنی میں "موعظۃ" ہے وہ اس مقام میں مستعمل موعظت سے عام اور بلند و بالا حقیقت پر مبنی ہے جہاں حکمت، موعظتِ حسنہ اور جدال بالتی ہی احسن تینوں حقیقتیں ایک ہی حقیقت میں سموئی ہوئی ہیں اور جو "موعظۃ" بن کر ان تینوں نظری درجات پر حاوی اور کارفرما ہے۔ کیونکہ قرآن حکمت بھی ہے اور موعظۃ حسنہ بھی اور فکر و نظر کے لحاظ سے مذاکرہ و مجادلۂ حسنہ کا امام بھی، وہ دلائل محکم اور براہین قاطع بھی رکھتا ہے اور انبیاء و رسل اور اُن کی امم و ملل کے واقعات عبرت آموز کو بھی بیان کرتا ہے اور توحید و شرک اور خیر و شر اور اصلاح و افساد اور حق و باطل اور صحیح و فاسد کے متضاد افکار پر محاکمہ کرتا اور ناطق فیصلہ بھی دیتا ہے لہٰذا وہ ایسی "موعظۃ" ہے جو بلید الفہم اور ذکی الفکر، عامی اور اہلِ علم، سادہ لوح اور فلسفی سب کے لئے ان کے درجات کے مطابق راہنمائی کرتے ہوئے صراطِ مستقیم تک پہنچاتا اور انسان کو "انسان" بناتا ہے۔

(باقی آئندہ)